خواجہ محمد زکریا

افکارِ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم

خلیفہ عبدالحکیم نوجوان مسلمانوں کے اس ذہین اور حساس طبقے کے ایک سرکردہ دانشور تھے جن کے آئیڈیل اقبال تھے۔ وہ اقبال کے مجتہدانہ اسلامی افکار سے بہت متاثر تھے اور انھی سے روشنی وحرارت لے کر ملتِ اسلامیہ کے احیاء کا سہانا خواب دیکھ رہے تھے۔ خلیفہ صاحب عمر میں اقبال سے اٹھارہ بیس سال چھوٹے تھے، لاہور میں آباد ایک کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور جب اقبال کی شہرت کا آغاز ہوا تو وہ سکول کے طالب علم تھے۔ اقبال انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسوں میں دلگداز قومی اور ملّی نظمیں دلکش ترنم سے سنانے کی وجہ سے خاص و عام میں متعارف ہو چکے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس آئے تو جلد ہی ان کی نظموں نے اتنی مقبولیت حاصل کر لی کہ پورے ملک میں ان کا نام مشہور ہو گیا۔ خصوصاً نظم 'شکوہ' نے بے مثال شہرت پائی جو انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۱ء میں پڑھی گئی تھی۔ اس سال خلیفہ صاحب نے میٹرک پاس کیا تھا اور اس کے بعد چند ماہ ایف سی کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی تھی، عجب نہیں کہ نوجوان خلیفہ عبدالحکیم نے یہ نظم اقبال کی زبان سے ریواز ہاسٹل میں منعقد ہونے والے اس جلسے میں سنی ہو۔ بعد ازاں خلیفہ صاحب حصولِ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے جہاں سے بی۔اے کیا۔ پھر ایم۔اے (فلسفہ) دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج سے کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ ۱۹۱۷ء میں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس وقت تک اقبال کی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی شائع ہو چکی تھیں۔ چونکہ خلیفہ صاحب بہت اچھی فارسی جانتے تھے، اس لیے فلسفہ اقبال کی ان

بنیادی کتابوں سے انہوں نے یقیناً استفادہ کیا ہوگا۔ یہی وہ ایام ہیں جب بعض دیگر ذہین اور ملی احساس سے بہرہ ور نوجوان اقبال کے ہاں جایا کرتے تھے اور ان کے افکار سے حسبِ استطاعت براہِ راست استفادہ کرتے تھے اور انھی کے نقوشِ پا پر چل کر ملت کی نشاۃ الثانیہ میں بڑے جذبے سے حصہ لینے کا محکم ارادہ کر لیتے تھے۔ درحقیقت یہی عرصہ ہے جب خلیفہ صاحب نے بھی مستقبل میں ملتِ اسلامیہ کے احیاء کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا۔

☆

خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی ملازمت کا زیادہ زمانہ حیدر آباد (دکن) میں بسر کیا۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ پھر یورپ گئے اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے صدرِ شعبہ بنے۔ ان کے حیدر آباد میں قیام کی مدت تقریباً ربع صدی بنتی ہے۔ حیدر آباد کے مختلف اہم لوگوں سے اقبال کے قریبی تعلقات تھے اور روایت ہے کہ ان کا تقرر جامعہ عثمانیہ میں اقبال ہی کی سفارش پر ہوا تھا۔ اس لیے وہاں اپنے دیگر علمی و ادبی مشاغل کے ساتھ ساتھ اقبالیات سے بھی اُن کا شغف برقرار رہا ہوگا۔

خلیفہ صاحب نے Ph.D. کے لیے Metaphysics of Rumi کا موضوع منتخب کیا تھا جو اقبال ہی کے اثرات کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ کشمیر میں پانچ سال تک وہ امر سنگھ کالج سری نگر کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۴۷ء میں حالات خراب ہوئے تو پھر حیدر آباد کا رُخ کیا۔ حیدر آباد پر بھارت نے قبضہ کر لیا تو کچھ عرصے کے بعد وہ پاکستان آ گئے۔ غلام محمد حیدر آباد میں خلیفہ صاحب کے قریبی دوستوں میں تھے جو اب پاکستان کے گورنر جنرل بن چکے تھے۔ خلیفہ صاحب اس وقت کسی بھی اہم پُرکشش عہدے پر فائز ہو سکتے تھے۔ مگر پاکستان میں شروع ہونے والی مذہبی کشمکش کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔

ان دنوں بعض ایسی جماعتوں کی طرف سے احیائے اسلام کی کوششوں کا آغاز ہو چکا تھا جنھوں نے قیامِ پاکستان کی شدید مخالفت کی تھی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران یقیناً سیاسی رہنماؤں نے لوگوں کو تحریر و تقریر کے ذریعے یہ پیغام دیا تھا کہ پاکستان کی ریاست کی بنیاد اسلامی نظام پر رکھی جائے گی لیکن اسلام کی کوئی ایک تعریف و توجیہہ نہ تو اس وقت تک ممکن تھی اور نہ ہی بعد میں ممکن رہی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا 'شد پریشان خواب من از کثرتِ تعبیر ہا' کی کیفیت پیدا ہوتی چلی گئی۔ درحقیقت یہ کام ہے بھی نہایت مشکل اور پیچیدہ۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے بہتر فرقے ہیں۔ حافظ نے کہا ہے:

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چو نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

اور ذوق نے اسی خیال کو یوں بیان کیا ہے:

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں
اپنا یہ ہے طریق کہ باہر حسد سے ہیں

مگر حقیقت یہ ہے کہ فرقوں کی تعداد ڈھائی تین سو سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ غالباً بہتر کا عدد محض کثرت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

چھوٹے چھوٹے غیر مقبول مسالک سے قطعِ نظر کر لیجیے۔ محض دو بڑے فرقوں کے عقائد کا تقابل کیجیے۔ اسلام کے پانچ بنیادی ارکین پر بھی ان کا اتفاقِ رائے نہیں۔ کلمۂ طیبہ مختلف، نماز پڑھنے کا طریقہ مختلف، سحر و افطار کے اوقات میں اختلاف، زکوٰۃ کے بارے میں الگ الگ نقطۂ نظر، حج کی اہمیت پر مختلف آرا۔ فقہی مسائل پر نمایاں اختلافات، قرآن کی مختلف توضیحات، احادیث کی صحت و عدمِ صحت کے مختلف پیمانے۔ اندریں حالات مذہبی جماعتوں نے نفاذِ اسلام کے لیے جس جدوجہد کا آغاز کیا تھا، اس کا ہدف صرف یہ ہونا چاہیے تھا کہ ملک میں اسلامی نظامِ عدل و انصاف نافذ کیا جائے۔ اسلام نے جس مساوات کا درس

دیا ہے، اس کے ثمرات محروم طبقات تک پہنچائے جائیں۔ ہر کسی کو ترقی کرنے کے یکساں مواقع میسر ہوں، ہر کسی کی بنیادی ضروریات پوری کی جائیں، ہر بچے کو اچھی تعلیم دی جائے اور کسی کنبے کے خراب اقتصادی حالات اس کی معاشرتی ترقی میں رکاوٹ نہ بنیں۔ لیکن مذہبی جماعتیں سیاست میں آگئیں۔ ان کے رہنماؤں نے یہ نقطۂ نظر اپنالیا کہ اقتدار پر ان کا قبضہ ہوگا تو اسلام نافذ ہو سکے گا اور اسلام بھی وہ جو ان کے نزدیک صحیح اسلام ہے۔ کوئی ایسی مذہبی سیاسی جماعت ایسی نہیں جو مسلکی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر دوسری جماعتوں سے اتحاد کرنے کو تیار ہو اور اگر عارضی طور پر خواہشِ اقتدار کی خاطر یکجا بھی ہو جائیں تو جلد ہی اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ شروع ہو جاتا ہے۔

اسلامی دُنیا کے بیشتر ممالک میں مختلف فرقوں کے لوگ بستے ہیں۔ اگر کہیں کسی فرقے کے دس پندرہ فیصد افراد بھی بستے ہوں تو انہیں اپنے مسلک کو ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر جبراً ایسا کرنے کی کوشش کی جائے تو دس فیصد لوگ بھی منظم ہو کر نوے فیصد لوگوں کا امن اور چین بآسانی درہم برہم کر سکتے ہیں۔ اس لیے بقائے باہمی کا اصول اپنائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے نظریات پر بخوشی قائم رہے لیکن دوسروں کو اتنی آزادی دے کہ وہ بھی اپنے نظریات پر قائم رہ سکیں۔ اسی کا نام بقائے باہمی ہے اور اسی کے نہ ہونے سے غیر اسلامی طاقتوں کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ مختلف فرقوں کو لڑا کر اسلامی ملکوں کو ترقی کی دوڑ سے نکال باہر کریں۔

اسلام دشمن طاقتوں نے اسلامی ممالک کو تقسیم کرنے کے لیے بڑی باریک چالیں چلی ہیں۔ مختلف عقائد کے لوگوں کو الگ الگ خریدا جاتا ہے۔ بعض اوقات بکنے والوں کو خود بھی نہیں معلوم ہوتا کہ مشتری کون ہے اور وہ کتنے میں بکے ہیں۔ بعض زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں اور وہ مناسب بھاؤ تاؤ کر کے اپنے جوہر فروخت کرتے ہیں اور پھر وہ جن لوگوں کو اپنے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ مفت بک جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں

کہ انھوں نے جنت النعیم خرید لی ہے۔ اس طرح بد قسمتی سے بہت لوگ طاغوتی طاقتوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ کبھی نادانستگی میں اور کبھی دانستہ۔ یہ ساری صورتِ حال دراصل عدمِ برداشت کا نتیجہ ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم نے اس خطرے کو آج سے ساٹھ سال پہلے ہی محسوس کر لیا تھا اور اقبال نے سو سال پہلے اس آنے والے خطرناک رجحان کو دیکھ لیا تھا۔ خلیفہ صاحب چونکہ مکتبِ اقبال ہی کے تربیت یافتہ تھے، اس لیے اقبال کے افکار کی روشنی میں وہ مسلمانوں کو بنیادی عقائد پر قائم رکھتے ہوئے بدلتی ہوئی دُنیا سے اجتہاد کے ذریعے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ یہ بہت بڑا مقصد تھا اور بے حد مشکل بھی۔ یہ کسی ایک شخص کے بس کا کام نہیں تھا۔ اس کے لیے ایک ادارے کی نہیں اداروں کی ضرورت ہے۔ ایک طرف سائنس اور ٹیکنالوجی نئے سے نئے مسائل سامنے لا رہی تھی، دوسری طرف علوم وفنون کی دُنیا میں انقلاب آ گیا تھا۔ اقتصادی ڈھانچا بہت پیچیدہ ہو چکا تھا۔ کوئی ملک دُنیا کے دوسرے ممالک کے مروجہ اقتصادی نظاموں سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ سیاست کی اپنی پیچیدگیاں تھیں، اقتصادی اور تعلیمی مسائل کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک میں مسلمانوں کی بڑی تعداد میں بس جانے کے سبب کئی اور مذہبی اور تہذیبی مسائل نے سر اُٹھا رکھا تھا۔

بعض لوگوں کے نزدیک ان مسائل کا ایک آسان حل یہ تھا کہ اپنے عقائد، روایات، تہذیب تمدن--- سب کو چھوڑ دیا جائے لیکن یہ کام بھی اتنا آسان نہیں جتنا سرسری نظر سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے--- لیکن اگر اپنی اپنی جگہ قائم رہیں تو زمانہ اور آگے نکل جائے گا اور ہم مزید پیچھے رہ جائیں گے۔

ایک مرتبہ اشفاق احمد نے ایف سی کالج میں اقبال پر لیکچر دیتے ہوئے سینہ تان کر طلبہ سے کہا تھا کہ مغرب نے ہمیں کیا دیا ہے؟ صرف گراری--- آپ مغرب سے کہیں ہمیں اس گراری کی کوئی ضرورت نہیں اسے واپس لے لو۔ طلبہ بہت خوش ہوئے۔ خوب تالیاں بجیں

مگر مَیں پریشان ہو گیا۔ کیا اشفاق احمد سامنے کی یہ بات نہیں سمجھتے کہ گراری واپس نہیں کی جا سکتی؟ اگر واپس کر دی جائے تو باقی باتیں چھوڑیے وہ ماڈل ٹاؤن سے اُردو سائنس بورڈ کے دفتر میں بھی وقت پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ گراری تو سائیکل میں بھی لگی ہوئی ہے۔ ہاں اگر وہ پورے پاکستان کو Aamish Village بنانا چاہتے تھے تو ٹھیک ہے۔ مَیں نے ایک سال بعد گورنمنٹ کالج کے یومِ اقبال میں کہا تھا کہ ''ہمیں گراری کی کوئی ضرورت نہیں، اسے واپس کر دو'' لیکن جملہ یہاں مکمل نہیں ہوتا۔ آگے یہ کہنا چاہیے کہ ''ہم غاروں میں واپس چلے جائیں گے یا درختوں پر پھر سے آشیانے بنا لیں گے۔''

ممکن ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ''شر'' ہو۔ یہ انسانوں کے کئی دکھوں کا سبب بھی ہو سکتی ہے۔ ہماری روح گاندھی کی طرح اُس سے نفرت بھی کرتی ہوگی۔ پھر بھی اسے واپس کرنا کسی کے بس میں نہیں۔ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اس کے بہتر استعمال کی سعی کریں۔ آخر گاندھی بھی اپنی روح کی بغاوت کو نظر انداز کر کے ہوائی جہازوں اور ریل گاڑیوں پر سفر کیا ہی کرتے تھے۔

حقیقی اور واقعی صورتِ حال یہ ہے: اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا مذہب زندہ حقیقت بن کر رہے اور ہم اس پر قائم رہتے ہوئے دُنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں شمار ہوں تو اسلام کی اصل روح کو زندہ رکھتے ہوئے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا پڑے گا۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔ علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم اسلام کو ایک زندہ مذہب کے طور پر قائم رکھنے کے لیے اسی کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

خلیفہ صاحب نے پاکستان آ کر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی تو ان کے پیشِ نظر یہی کام تھا۔ اس کے لیے انھیں اقبال اور قائداعظم کے خیالات کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ یہی بانیانِ پاکستان تھے۔ قائداعظم بنیادی طور پر قانون دان تھے۔ اسلامی قوانین سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ اقبال کا ذہنی پس منظر ان سے زیادہ وسیع تھا۔

انھوں نے مکتبِ قرآن میں روایتی علماء سے تعلیم حاصل کی تھی اور مولوی میر حسن جیسے سرسیّد کے مداح سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ مطالبِ قرآن سے بخوبی آگاہ تھے۔ عربی جانتے تھے۔ بیرسٹر تھے، اس لیے مغرب قانون سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ اپنے دور کے جیّد علماء سے حدیث اور فقہ کے مسائل پر مشاورت کرتے رہتے تھے، اس لیے وہ نئی دُنیا میں نفاذِ اسلام کے تقاضوں کو سمجھتے تھے اور ان پیچیدگیوں کو بھی خوب جانتے تھے جو روایتی فقہ پر اڑ جانے سے پیدا ہوسکتی تھیں۔ وہ شاعر بھی تھے اور مفکر بھی۔ وہ مشرقی علوم وفنون کے ساتھ ساتھ مغربی افکار پر بھی حاوی تھے۔ غالبًا ہندوستان میں اسلامی سلطنتوں کے آغاز سے آج تک کوئی دوسری ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو بیک وقت مغربی اور مشرق سے برابر کی آگاہی رکھتی ہو۔ اس لیے پاکستان میں نفاذِ اسلام کے مسئلے کو اقبال کی مہیا کی ہوئی روشنی میں دیکھنا ضروری تھا۔ رہروانِ تحقیق انھی کے سانولے سایوں میں آگے بڑھ سکتے تھے۔ اقبال ہی کے لفظوں میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہتر توجیہات سامنے آسکتی تھیں لیکن نقطۂ آغاز اقبال کی شاعری اور نثر ہی ہوسکتی تھی۔ اس مشکل کام کو آگے بڑھانے کے لیے خلیفہ عبدالحکیم نے پہلے ایک مضمون ''اقبال اور مُلاّ'' لکھا جو اکتوبر ۱۹۵۳ء کے 'المعارف' میں شائع ہوا اور بعد ازاں کئی بار کتابچے کی شکل میں چھپا۔ روایت ہے کہ ایک سیاسی مذہبی جماعت کے کارکنوں نے بڑی تعداد میں خرید کر اسے نذرِ آتش کر دیا تھا کیونکہ اس میں نام لیے بغیر ان کے قائد پر تنقید کی گئی تھی۔ آج یہ کتابچہ اکثر کتب خانوں سے غائب ہو چکا ہے۔

اس کتابچے میں بنیادی بات یہی کہی گئی تھی کہ ایک خاص قسم کے سنگ بستہ مذہبی خیالات رکھنے والے حضرت اس بات کا شعور ہی نہیں رکھتے کہ موجودہ زمانے میں اسلام کو کس طرح کے خطرات درپیش ہیں۔ اس میں کہیں کہیں لہجہ شوخ ہوگیا تھا اور کہیں شدید طنز وتعریض سے بھی کام لیا گیا ہے لیکن بنیادی بات یہی بتائی گئی ہے کہ اسلام کے بنیادی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جدید انکشافات کی روشنی میں کسی بات پر نظرِ ثانی کرنا حرام نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

''اقبال کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ قرآنِ کریم کی تعلیم محض کسی ایک زمانے اور ایک قوم کے لیے نہیں ہے۔ ہر زمانہ جب اس میں غوطہ لگائے تو اس کو نئے آبدار موتی ملیں گے۔ کسی ایک زمانے میں لکھی گئی قرآن کی تفسیر کے بعض اجزا دوسرے زمانے کے لیے بے مصرف ہو جائیں گے اور زندگی کے جدید انکشافات کی روشنی میں لوگوں کو نئے معنی نظر آنے لگیں گے جن تک متقدمین کی رسائی نہ ہو سکتی تھی۔ فقہ کے تمام دفتر کو وہ نظرِ ثانی کا محتاج سمجھتے تھے اور اس کے خواہش مند تھے کہ زندگی کے بدلے ہوئے علائق کے لیے قرآن کی بنیادی تعلیم کے مطابق قوانین میں ردّ و بدل کی جائے۔ فقہ میں وہ غیر مقلد تھے۔ دین میں قرآن کے سوا کسی چیز کو وہ ایسی سند نہ سمجھتے تھے جس کے سامنے شدت میں سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔'' (صفحہ ۵)

''جب دین کا یہ کام رہ جائے کہ ہر فروعی عقیدے کو معیارِ کفر و ایمان بنا کر لوگوں میں وصل کی بجائے فصل پیدا کیا جائے تو جو ملتِ دین کی اس مسخ شدہ صورت سے متاثر ہوگی، اس کا یہی حشر ہوگا۔'' (صفحہ ۶)

''غمِ دین تو غمِ عشق ہوتا ہے، غمِ روزگار نہیں ہوتا اور ملائیت میں کہیں عشق کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ فقیہانہ موشگافیوں میں اس کو عشق کہاں سے ملے گا۔'' (صفحہ ۷)

یہ تو انھوں نے مُلّا کے بارے میں رائے دی ہے۔ ہر خرقہ سالوس میں چھپے ہوئے کعبے کے برہمنوں کے بارے میں وہ یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں:

''ذوقِ اقتدار اگر نفس کے تحت الشعور میں گھس جائے تو دعوائے نبوت و مہدویت سے اُدھر نہیں رکتا۔ یورپ اور امریکہ کے پاگل خانوں اور امراضِ نفسی کے شفاخانوں میں بڑی کثرت سے اپنے آپ کو مسیح سمجھنے والے ملتے ہیں۔ یہ مجانین اگر مشرق میں ہوتے، خصوصاً خطۂ پنجاب میں، تو اُن میں سے کوئی ذہین دیوانہ، بکارِ خویش ہشیار، ضرور اچھی خاصی امت پیدا کر لیتا۔'' (صفحہ ۱۰)

لوگ اکثر حیران ہوتے ہیں کہ مذہب کے ظواہر پر عمل کرنے والے اپنے ذاتی معاملات میں دیانت سے عاری کیوں ہوتے ہیں۔ خلیفہ صاحب نے علامہ اقبال کے حوالے سے اس کا بہت دلچسپ اور چشم کشا جواب دیا ہے:

''علامہ اقبال ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ اکثر پیشہ ور مُلّا عملاً اسلام کے منکر، اس کی شریعت سے منحرف اور مادّہ پرست دہریے ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ ایک مقدمے کے سلسلے میں ایک مولوی صاحب اکثر میرے پاس آتے تھے۔ مقدمے کی باتوں کے ساتھ ساتھ ہر وقت یہ تلقین ضرور کرتے تھے کہ دیکھیے ڈاکٹر صاحب آپ بھی عالم دین ہیں اور اسلام کی بابت نہایت لطیف باتیں کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ آپ کی شکل مسلمانوں کی سی نہیں۔ آپ کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں--- ایک روز مولوی صاحب نے تلقین میں ذرا شدت برتی تو مَیں نے عرض کیا کہ مولوی صاحب! آپ کے وعظ سے متاثر ہو کر ہم نے آج ایک فیصلہ کیا ہے۔ آپ میرے پاس اس مقدمے کے سلسلے میں آتے ہیں کہ آپ باپ کے ترکے میں سے اپنی بہن کو زمین کا حصہ نہیں دینا چاہتے اور کہتے ہیں کہ آپ کے ہاں شریعت کے مطابق نہیں بلکہ رواج کے مطابق ترکہ تقسیم ہوتا ہے اور انگریزی عدالتوں نے اس کو تسلیم کر لیا ہے۔ میری بے ریشی کو دینی کوتاہی سمجھ لیجیے لیکن رواج کے مقابلے میں شریعت کو بالائے طاق رکھ دینا اس سے کہیں زیادہ گناہگاری ہے۔ مَیں نے آج یہ عہد کیا ہے کہ آپ بہن کو شرعی حصہ دے دیں اور مَیں ڈاڑھی بڑھا لیتا ہوں۔ لائیے ہاتھ! آپ کی بدولت ہماری بھی آج اصلاح ہو جائے۔ اس پر مولوی صاحب دم بخود ہو گئے اور میری طرف (اُن کا) ہاتھ نہ بڑھ سکا۔'' (صفحہ ۱۳،۱۴)

اسی طرح خلیفہ عبدالحکیم نے اس کتابچے میں بہت سے نام نہاد رہنمایانِ دین کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ تاہم اُس کا یہ مطلب نہیں کہ اہلِ دُنیا ٹھیک ہیں اور وضعِ مومنانہ

رکھنے والے ہی غلط ہیں۔ غلط افراد تو ہر کہیں ہیں لیکن جو لوٹ مار اور فریب دہی دین کے نام پر کی جائے وہ زیادہ قابلِ مذمت ہے کیونکہ یہ لوگوں کو اہلِ دین ہی نہیں دین سے بھی بدظن کر دیتی ہے۔

اس کتابچے کا اختتام خلیفہ صاحب نے ایک حدیث پر کیا ہے جو حضرت علیؓ سے مروی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اُمت پر ایک زمانہ آنے کو ہے کہ اسلام کا فقط نام ہی رہ جائے گا اور قرآن کے مرقوم الفاظ ہی رہ جائیں گے۔ مسجدیں ویسی آباد دکھائی دیں گی، لیکن ہدایت کے لحاظ سے ویرانہ ہوں گی۔ علماء زیرِ سما بدترین خلائق ہوں گے۔ فتنہ انہی میں سے اُبھرے گا اور انہی کی طرف لوٹے گا---'' (ص ۲۷)

خلیفہ صاحب اس حدیث کو نقل کر کے یوں رقم طراز ہیں:

''ذرا ایمان داری سے چشمِ بصیرت کھول کر اس کا جائزہ لیجیے کہ کیا ہم اس زمانے میں نہیں ہیں جس کے متعلق یہ پیش گوئی تھی۔ کیا مسجدوں کے امام ایسے نہیں ہیں جن سے کسی کو کچھ ہدایت حاصل (نہ) ہو سکے۔ وہ فقط آیات و روایات کے دہرانے والے ہیں۔ ان میں سے کچھ حوصلہ مند سیاست میں حصولِ اقتدار کے متمنی، اور اس کے لیے کوشاں ہیں لیکن ابنِ خلدون جیسا حکیم ان کے بارے میں فتویٰ دے گیا ہے کہ **العلماء ابعد الناس عن السیاست** (علمائے سیاست لوگوں میں سب سے پست ہیں۔ ترجمہ راقم الحروف) ایسے لوگ حقائق سے، حیات سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے جو مشورہ دیں گے وہ غلط ہوگا اور موجبِ فساد و خسران ہوگا۔ جب تک اچھی قسم کے علمائے دین پیدا نہ ہوں جو روحِ عصر اور روحِ اسلام دونوں سے کماحقہٗ واقف ہوں تب تک اس طبقے کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار دینا پاکستان کو ضلالت کے گڑھے میں دھکیلنا ہے۔ اللہ کی رحمت سے اُمید ہے ایسا نہیں ہوگا اور اچھی بصیرت

رکھنے والے لوگ ملائیت کو اُبھرنے نہیں دیں گے۔ لا تقنطو من رحمة الله۔
(صفحہ ۲۷-۲۸)

خلیفہ صاحب کی بصیرت دیکھیے کہ انھوں نے ۱۹۵۳ء میں مستقبل کے پاکستان کی دھندلی سی تصویر دیکھ لی تھی۔

'اقبال اور ملا' کے چار سال بعد خلیفہ عبدالحکیم نے ۱۹۵۷ء میں اقبالیات کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب 'فکرِ اقبال' شائع کی۔ یہ تصنیف افکارِ اقبال کے تمام اہم پہلوؤں پر محیط ہے۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ پنجاب یونیورسٹی کے نصابات کا جزو تھی لیکن اب کئی برسوں سے خارج کی جا چکی ہے جس کی بنیادی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ بہت ضخیم ہے اور طلبہ اب مطالعے کے عادی نہیں رہے۔ طلبہ تو اب 'گٹ تھرو گائیڈز' پڑھتے تھے۔ اس منطق کی رُو سے تو تمام کتابیں خارج از نصاب کر کے گٹ تھرو گائیڈز کو نصاب میں شامل کر دینا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'فکرِ اقبال' آج بھی اقبالیات پر اگر بہترین نہیں تو چند نہایت اہم تصانیف میں شامل ہے۔ اس میں کمیاں بھی ہیں مثلاً ضخامت کی ایک وجہ ایک ہی نکتے کی کئی جگہ تکرار ہے، دوسری کمی اشعار کی بھرمار ہے جو یقیناً خاصی کم کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں خلیفہ صاحب اشعار لکھنے میں حافظے پر انحصار کرتے ہیں اور کئی مقامات پر اشعار اصل متن سے دُور ہو جاتے ہیں۔ دُنیا کے اہم مفکرین کے نظریات سے وہ آگاہ ہیں جن میں فلسفی، مؤرخ سائنس دان اور دیگر علوم وفنون کے ماہرین شامل ہیں لیکن ان کے خیالات کا وہ ملخص پیش کرتے ہیں۔ عموماً اصل متن سے اقتباسات پیش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اس لیے قاری تک بعض اوقات یہ خیالات قدرے تبدیل ہو کر پہنچتے ہیں لیکن مجموعی طور پر وہ مفکرین کے خیالات کو مسخ کر کے پیش نہیں کرتے۔ انھوں نے اقبال کے افکار میں سے ایسے نکات چنے ہیں جو افراد اور اقوام کے لیے مثبت ہیں۔ مثلاً اقبال زندگی میں عمل کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ دُنیا میں اقوام و افراد کا کشمکشِ

حیات میں شریک ہونا ایک ازلی وابدی حقیقت ہے۔ جن قوموں نے کوشش، کاوش، حرکت اور عمل کو اپنا شعار بنایا وہ زندگی کی دوڑ میں آگے نکل گئیں اور جن قوموں نے آرام طلبی اور آسانی کی زندگی اپنائی، وہ پیچھے رہ گئیں۔ اسی لیے اقبال سمجھتے تھے کہ خانقاہی تصوف اور تقدیر پرستی نے ملتِ اسلامیہ کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ اقبال ڈارون کے نظریے سے یقیناً واقف تھے۔ مگر ڈارون کسی شعوری کشمکشِ حیات کی وکالت نہیں کرتا نہ ہی اس کے ہاں یہ خیال موجود ہے کہ زیادہ تنومند انواع زندہ رہیں اور کمزور انواع مر گئیں۔ اس نے یہ کہا ہے کہ طاقت ور انواع سے زیادہ ماحول کے ساتھ Adjust کرنے والی انواع زندہ رہیں اور یہ Adjustibility بہت سے عوامل کی محتاج تھی جس میں اتفاقات نے بھی حصہ لیا۔ لیکن بعض دیگر مفکرین نے ڈارون کے نظریے سے اپنے اپنے نظریات اخذ کر لیے جو غلط بھی تھے اور صحیح بھی۔ قوموں کے بارے میں یہ تصور بالکل درست ہے کہ جن اقوام کو دوسروں سے مقابلے کا سامنا ہوا ان کی صلاحیتیں بہتر انداز میں بروئے کار آئیں۔ ایشیا اور یورپ میں یہ مقابلہ زیادہ شدید تھا، اس لیے یہاں کی اقوام نے عرصۂ دراز تک باقی دُنیا کی قوموں پر اپنی برتری ثابت کی۔ آسٹریلیا، امریکہ اور افریقہ میں مقابلے کی کیفیت نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کے اصل باشندے ترقی کی کمترین سطح پر رہے۔ مسلم قوم کشمکش میں پڑ کر کندن بنی۔ فتوحات تو اس کا ایک پہلو تھا۔ علمی اور سائنسی ترقیوں میں انھوں نے یونان کے علوم وفنون کو آگے بڑھایا لیکن پھر علوم وفنون کو ترقی دینے سے یورپی اقوام مسلمان ممالک کو بہت پیچھے چھوڑ گئیں۔ اقبال کے پورے فکری نظام میں اس نظریے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن اقبال اس کشمکشِ حیات کو محض انسانوں کی مادّی آسودگی کے لیے وقف کرنے کے قائل نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مادّی ترقیوں کو انسانی فلاح کے لیے وقف کر دیا جائے۔ دُنیا کا ہر انسان آسودہ اور مطمئن ہو۔ استحصال، جبر اور ظلم کا خاتمہ ہو اور اس طرح انسانی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن جائے:

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتہ شرعِ مبیں این است و بس

اُنھوں نے خودی، بیخودی اور مردِ مومن کی اصطلاحیں اسی مثالی معاشرے کی تشکیل کے لیے وضع کی ہیں۔ پہلے فرد اپنی خفتہ صلاحیتوں کو پہچانے، پھر ان کی تربیت کرے اور جب وہ اپنی صلاحیتوں میں مہارت حاصل کر لے تو انہیں معاشرے میں خیر پھیلانے کے لیے رو بہ عمل لائے۔

یہ مثالی نقطۂ نظر ہے۔ اس طرح کے مثالی معاشرے کی تشکیل کا خواب بہت سے مفکروں نے دیکھا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم اس طرح کے معاشروں کی تشکیل کو حقیقت سے بعید سمجھتے ہیں۔ اس کی طرف انہوں نے اتنے خوبصورت انداز میں اشارہ کیا ہے کہ اقبال کے نظریے پر تنقید بھی ہو گئی ہے اور اس میں حقیقت کا جو شائبہ ہو سکتا ہے وہ بھی سامنے آ گیا ہے۔ خلیفہ صاحب جاوید نامہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''نصب العینی تہذیب میں وہ جھوٹی مساوات نہیں ہوگی جو مغربی جمہوریت نے پیدا کی ہے۔ نصب العینی تہذیب میں عورتیں مائیں بننے سے گریز نہ کریں گی جو صورت کہ تہذیبِ فرنگ میں پیدا ہو گئی ہے۔ یہ کیفیت سرمایہ داری اور ذاتی ملکیت کا ثمرِ مسموم ہے۔ نصب العینی انسان زمین کی ملکیت کے لیے ایک دوسرے کی گردنیں نہیں کاٹیں گے۔ تمام ارض ملک خدا ہوگی۔ اگر کوئی پوچھے کہ ایسی تہذیب کا کہیں وجود بھی ہے یا اس کا کچھ امکان بھی ہے تو اس کا جواب عارفِ رومی کی زبان میں یہ ہو سکتا ہے:
>
> گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
> گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست
>
> --- اقبال نے بھی جو مردِ مومن کے صفات جا بجا بیان کیے ہیں وہ بھی یکجا تو کسی انسان میں نظر نہیں آتے۔ وہ بھی ایک نصب العینی نقشہ اور معیارِ کمال ہے۔ مومن بننے کی کوشش میں ان میں سے جتنے صفات کو کوئی اپنا سکے اپنا لے۔''

اس کتاب کا بابِ پنجم 'اسلام اقبال کی نظر میں' اور باب ششم 'شاعر انقلاب' خصوصاً بہت اہم ہیں۔ باب پنجم میں اقبال کے ان نظریات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں جو بالعموم عامی مسلمانوں ہی کو نہیں، پڑھنے لکھنے والوں کو بھی پسند نہیں آتے۔ مثلاً جنت اور دوزخ ذہنی کیفیات کے نام ہیں یا ہر کوئی مرنے کے بعد زندہ نہیں ہوتا صرف مضبوط خودی والے زندہ ہوتے ہیں۔ ان خیالات پر خلیفہ صاحب نے تنقید نہیں کی محض وضاحت کر کے آگے چلے گئے ہیں۔ لیکن انھوں نے اسلام کی عالمگیریت پر خصوصی توجہ مبذول کی ہے اور اقبال کے اس خیال کی توصیف کی ہے کہ اسلام کا خدا رب العالمین اور اسؐ کا نبیؐ رحمۃ للعالمین ہے۔ لیکن تنگ نظری اور تعصب نے خدا کو صرف رب المسلمین اور نبی کو صرف رحمۃ المسلمین بنا دیا ہے۔ یہ رواداری مسلمانوں میں ناپید ہوگئی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے سورۂ بقرہ کی ایک آیت سے استشہاد کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

> ''جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور صابی اور نصاریٰ ان میں سے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو ان پر نہ کوئی خوف ہے، نہ یہ غمگین ہوں گے۔''

خلیفہ صاحب اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کی فوقیت از روئے قرآن اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ تم آئینِ الٰہی کی پابندی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو لائحۂ عمل بناؤ۔ جب تم میں یہ بات نہیں رہے گی تو اسلام کسی اور ملت کے حوالے کر دیا جائے گا جس کے عقائد و اعمال خدا کی کسوٹی پر کھرے ثابت ہوں۔

غرض فکرِ اقبال میں بہت سی خیال افروز بحثیں ہیں۔ اگر ان میں سے چند ایک کا بھی مزید ذکر کیا گیا تو مقالہ بہت طویل ہو جائے گا۔

اقبالیات پر جتنا تنقیدی اور توضیحی لٹریچر موجود ہے، اُردو کے کسی دوسرے شاعر پر اس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں لکھا گیا لیکن اس سرمائے میں محض گنتی کی چند کتابیں ہیں جو بہتر رہنمائی

کرتی ہیں اور اعادہ وتکرار کی ذیل میں نہیں آتیں۔ میری دانست میں 'فکرِ اقبال' انھی گنی چنی تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی اشاعت پر تقریباً چون برس گزر چکے ہیں، اب بھی یہ اقبالیات کے روز افزوں ذخیرے میں بہت نمایاں تین چار کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی ازسرِ نو تدوین کی جائے۔ ضخامت کم کرنے کے لیے چند ابواب حذف بھی کیے جاسکتے ہیں اور اشعار کی متعدد مثالیں کم کی جاسکتی ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں اس کتاب کا جو ایڈیشن شائع ہوا۔ چند اضافی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس میں کئی کمیاں ہیں اور طباعتی اغلاط سے بھی پُر ہے۔ نئی نسلوں کی خرد افروزی کے لیے اس کی بہت بہتر اشاعتِ نو کی ضرورت ہے۔ مذکورہ ایڈیشن میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ ابتدائی چند اشاعتوں میں خلیفہ صاحب نے خطباتِ اقبال کی تلخیص دی ہے، اسے خارج کر دیا گیا ہے۔ خطبات کا اندازِ بیان بہت مشکل اور فلسفیانہ اصطلاحوں سے گرانبار ہے۔ اس کے کئی تراجم ہوئے ہیں لیکن ان کو سمجھنا اصل سے زیادہ مشکل ہے۔ خلیفہ صاحب کی یہ تلخیص پھر بھی ان تراجم سے زیادہ قابلِ فہم ہے، اس لیے اسے کتاب میں شامل رہنا چاہیے۔ تفہیمِ اقبال کے لیے خطبات سے رجوع کرنے کا مشورہ دینے والوں میں خلیفہ صاحب سابقون میں سے ہیں۔ جسٹس جاوید اقبال نے بعد میں ان پر بہت زور دیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ خلیفہ صاحب بہت اچھے شعر فہم ہونے کی وجہ سے اقبال کی شاعری پر بھی بھرپور توجہ دیتے ہیں جب کہ جسٹس صاحب شاعری سے حوالے دینے کو قریب قریب مسترد کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خلیفہ صاحب کا نقطۂ نظر زیادہ متوازن اور درست تر ہے۔